اخلاق احمد دہلوی (چہل امیراں کا غریب)

مارچ کا مہینہ لاہور میں آمد بہار کا پیغام لاتا ہے، اس مہینے میں لاہور کے بڑے بڑے گھروں کے کشادہ لان رنگ برنگے پھولوں سے بھر جاتے ہیں، چیت کی ہوائیں درختوں سے لپٹ کر موسم سرما کے خاتمے کا اعلان کرتی ہیں۔ یہ وہ موسم ہے جب کھلے آسمانوں میں اڑتے ہوئے پرندے دیکھ کر مردہ دلوں میں بھی زندگی کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور لاہور کے شہری آنے والے گرمی کے دنوں کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔

ایسے موسم میں، مارچ 1992 کے وسط میں، تین آدمی لاہور کے بہت سے قبرستانوں میں سے ایک قبرستان میں دفنانے کے لیے ایک میت لے کر پہنچے، گورکن نے ان کی طرف غور سے دیکھا، دیکھنے میں اچھے بھلے شریف آدمی نظر آرہے تھے مگر اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس شہر میں کوئی جنازہ اتنا چھوٹا اور کوئی آدمی اتنا بے وقعت ہو سکتا ہے کہ اس کے آخری سفر کے لیے صرف تین آدمی اس کی میت لے کر قبرستان پہنچیں۔

''آپ کسی کو قتل کر کے لاش دفنانے کے لیے تو نہیں لائے؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ جب اسے یقین دلایا گیا کہ جنازہ کے اس مختصر جلوس میں متوفی کے صاحبزادے جو ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہیں، شامل ہیں تو اس نے رسمی خانہ پری اور مقررہ فیس وصول کر کے لاش کو دفن کرنے کے انتظامات کر دیے۔ لاہور کی خاک نے کھلتے ہوئے پھولوں اور بہار کی خوشبوؤں سے لبریز اس دن جس میت کو اپنی آغوش میں سمیٹا وہ 73 برس پہلے دہلی میں پیدا ہونے والے سرتاپا دہلوی اخلاق احمد تھے۔ تدفین کے بعد اخلاق صاحب کا اکلوتا بیٹا اور مرحوم کی بیگم سمن آباد میں اپنے گھر نہیں گئے۔ مرحوم کی بیوہ نے اعلان کر دیا کہ وہ اب اس گھر میں جہاں اس نے اپنے عظیم شوہر کے ساتھ کئی برس گزارے تھے اور جواب وہاں کبھی نہیں آئیں گے قدم نہیں رکھیں گی۔ یہ دونوں پسماندگان جیل روڈ کی برج کالونی میں عظمیٰ گیلانی کے گھر آ گئے اور بہت دنوں تک یعنی جب تک کوئی دوسرا گھر نہیں مل گیا، یہیں مقیم رہے۔ عظمیٰ کے ہاں پہنچ کر ان کے بیٹے نے اخلاق صاحب کے چیدہ چیدہ دوستوں کو اس سانحے کی اطلاع دی، کچھ کو بتا دیا کہ اب وہ اور اس کی والدہ عظمیٰ کے

گھر ہیں، بعض کو یہ اطلاع دینا وہ بھول گیا۔ یہ اطلاع پاتے ہی کچھ دوست فوراً ان کے گھر پہنچے جہاں تالا پڑا ہوا تھا، ایسے ہی ایک دوست منیر چودھری نے جو عرصے سے میرا شریک کار ہے اور جو میرے دفتر کی محفلوں میں اخلاق صاحب کی باتیں سنتا اور ان سے بہت پیار کرتا رہا ہے، مجھے فون کیا اور بتایا کہ عینی کو آپ کا فون نہیں مل رہا تھا اس نے مجھے فون کر کے اخلاق صاحب کے آخری سفر پر جانے کی اطلاع تو دی مگر جب میں ان کے گھر پہنچا تو وہاں تالا پڑا ہوا تھا، مجھے منیر کی یہ بات سن کر اس فیصلے پر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ اخلاق صاحب کی بیگم اور بیٹا عظمیٰ کے گھر ہوں گے۔ میں فوراً وہاں پہنچا تو وہ واقعی وہاں موجود تھے۔

انتقال سے چھ سات ماہ قبل ان پر دل کا دوسرا (شاید تیسرا) دورہ پڑا تھا، اس وقت بھی کئی روز بعد مجھے خبر ملی کہ ان پر بیماری دل پھر حملہ آور ہوئی ہے اور وہ غالباً شہر کے فلاں ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ میں تین روز تک لاہور کے تمام ہسپتالوں میں امراض قلب کے وارڈوں کی خاک چھانتا رہا مگر وہ کہیں نہ ملے پھر میں اس خیال سے ان کے گھر گیا کہ ان کے مالک مکان کو جو اسی مکان کے نچلے حصہ میں رہتے ہیں پتہ ہوگا کہ وہ کون سے ہسپتال میں ہیں۔

مالک مکان نے جسے وہ ہمیشہ مکان دار کہتے تھے میرے استفسار پر بتایا کہ وہ ابھی دو گھنٹے قبل ہسپتال سے آ گئے ہیں اور اوپر موجود ہیں۔ اوپر پہنچا تو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، میں نے دبی زبان سے گلہ کیا کہ بیماری کی اطلاع مجھے کیوں نہیں دی گئی۔ ان کی بیگم نے جواب دیا کہ عظمیٰ ہی انھیں ہسپتال میں داخل کرانے لے گئی تھیں۔ ان کا بیٹا دو تین برس سے آسٹریلیا میں مقیم تھا، اخلاق صاحب نے عظمیٰ کو تاکید کی کہ اسے اور حمید اختر کو ہرگز اطلاع نہ دی جائے، بیٹا پردیس میں ہے اور حمید اختر صاحب پہلے ہی ذاتی پریشانیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں اس لیے انھیں اور پریشان نہ کیا جائے۔

عظمیٰ گیلانی نے انھیں ڈاکٹر شہریار کی زیر نگرانی لاہور میں امراض قلب کے نئے اور بہت اچھے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ بیگم ساتھ رہیں، ڈاکٹر شہریار نے بہت توجہ سے ان کا علاج کیا، دیکھ بھال عظمیٰ کرتی رہیں۔ وہ چند دنوں ہی میں بظاہر ٹھیک ہو کر گھر آ گئے۔ اس سے پہلے جب میں بے کار تھا اور ریگل والے اپنے پرانے دفتر بیٹھا کرتا تھا وہ مہینے میں ایک دو بار، رکشہ میں بیٹھ کر مجھ سے ملنے ضرور آتے، ٹھیک ہونے کے بعد اب انھوں نے اسی طرح مساوات کے دفتر میں آنا شروع کر دیا، میرا کمرہ روزنامہ مساوات کی عمارت کی دوسری منزل پر تھا، وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے، گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھتے، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں، زیادہ تر شعر و ادب کے مضامین پر گفتگو ہوتی

اور وہ چلے جاتے، واپسی پر عام طور سے میں انھیں گاڑی میں گھر چھوڑ آتا۔ ایک دفعہ میں نے کہا ''اس بیماری میں رکشہ جیسی بے ہودہ سواری میں آپ کا یہاں آنا اور پھر سیڑھیاں چڑھنا درست نہیں ہے۔ آپ یہ خطرہ مول نہ لیا کریں۔ مجھے فون کر کے بلایا کریں۔

''واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ملنے کو دل ہمارا چاہیے اور ملنے آئیں آپ، وہ بھی ہمارے بلانے پر.....'' اس مختصر اور جامع جواب کے بعد میں خاموش رہا۔ اس کے بعد ایک دو بار میں خود ان کے ہاں گیا مگر چند ماہ بعد ایک دفعہ پھر ان پر بیماریِ دل کا حملہ ہوا۔ اس دفعہ یہ حملہ بہت شدید تھا، عظمیٰ انھیں پھر ہسپتال لے گئیں۔ عینی کو اس نے اخلاق صاحب کے منع کرنے کے باوجود فون کر دیا مگر مجھے پھر بھی اطلاع نہ دی۔ وہ کافی دن ہسپتال میں رہے، بیٹا بھی پہنچ گیا۔ اس نے ان کی بہت دیکھ بھال کی، یوں وہ ایک دفعہ پھر موت کے منھ سے بچ کر گھر واپس آئے۔ ڈاکٹروں نے کم از کم تین ماہ تک سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے منع کر دیا تھا۔ آخری ملاقات میں جب میں انھیں دیکھنے ان کے گھر گیا تو کہنے لگے ''ابھی ایک مہینہ پابندی کا باقی ہے، اس کے بعد اجازت مل جائے گی تو پھر آپ کے پاس آئیں گے۔''

ان کا ارادہ یہی تھا مگر لہجے میں مضبوطی نہیں تھی، شاید وہ اپنی حالت سے واقف تھے ان کے بستر کے سامنے دیوار پر ایمرجنسی فون نمبر لکھا ہوا تھا تاکہ طبیعت خراب ہونے یا بیماری کا حملہ ہونے کی صورت میں فوراً ایمبولینس منگوائی جا سکے۔ مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹروں کی ٹیم ہر ہفتے معائنے کے لیے آتی ہے۔ یہ نمبر بھی ان کا ہے تاکہ ہنگامی ضرورت کے وقت انھیں ہسپتال پہنچایا جا سکے۔ میں اس دن وہاں سے خاصا مایوس گھر لوٹا، اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ چراغ سحری ہیں، خود انھیں بھی پتہ تھا لیکن بظاہر وہ خاموش اور پُرسکون تھے۔

سیڑھیاں چڑھنے اترنے پر پابندی کی مدت پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پھر ہسپتال پہنچے۔ اب کی دفعہ وہ گھر واپس نہیں آئے بلکہ لاہور ہی میں پیوندِ خاک ہوئے۔

اخلاق احمد دہلوی کی میت کے بارے میں جس شخص نے اس شبہے کا اظہار کیا تھا کہ شاید کسی کو قتل کرنے بعد کس مپرسی کی حالت میں دفنانے کے لیے یہاں لایا گیا ہے اسے کیا معلوم کہ وہ کس شخص کو لحد میں اتار رہا ہے۔ اس کو خبر ہو بھی کیسے سکتی تھی جب کہ جن لوگوں کے درمیان انھوں نے لاہور میں چالیس پینتالیس سال گزارے ان کی غالب اکثریت اس امر سے ناواقف رہی کہ وہ کتنے بڑے آدمی سے ہمکلام ہیں۔ جس طرح دہلی کا کوچہ چہل امیراں مرور ایام سے کوچہ چیلان بن گیا اسی طرح 1946 تک شہزادوں کی سی زندگی بسر کرنے والے اخلاق احمد دہلوی نے

نئے ملک پاکستان میں آ کر درویش کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ جوگ لے لیا تھا۔ میرا ان کا تعلق تیں پینتیس برس پرانا ہے۔ مجھے بالکل یاد نہیں ہے کہ تعلقات کا آغاز کیسے ہوا مگر وہ برسوں روزانہ ریگل میں، میرے دفتر میں باقاعدگی سے آتے رہے۔ وہ لاہور ہوٹل کے عقب سے، سائیکل پر صبح سویرے گھر سے نکلتے، ریڈیو کی صبح کی ٹرانسمیشن بھگتاتے، پھر رائل پارک میں حکیم محمد علی اور بیڈن روڈ پر رانا سویٹ مارٹ کے رانا حبیب کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھتے۔ اس کے بعد ریگل آ جاتے، جہاں بہت سے لوگ جمع رہتے۔ ادیب صحافی، سیمنٹ فروش، سیاسی کارکن اور لاہور کے تماش بین غرضیکہ ہر قسم کا آدمی اس دفتر میں موجود رہتا، صوفی غفار مرحوم، صدرالدین، منیر چودھری، غلام احمد اور معلوم نہیں کتنے ہی اور لوگ محفل جماتے، یہاں سیاسی بحثیں ہوتیں، ادبی معرکوں کا ذکر کیا جاتا۔ اخلاق صاحب کی آواز ان سب میں سب سے زیادہ نحیف ہوتی وہ اونچا بولتے ہی نہیں تھے، ان کا لہجہ یکساں، ٹھہرا ہوا مدھم مدھم ہوتا۔ سبھی ان کی عزت کرتے تھے جو جانتے تھے وہ بھی اور جو کبھی کبھی آنے والے تھے وہ بھی۔ ان کا رکھ رکھاؤ، شائستگی اور مہذب لہجہ سبھی کو ان کی عزت کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یہ محفل ہندوستان پاکستان کی دونوں جنگوں یعنی 1965 اور 1971 میں بھی جب لاہور شہر پر دشمن کے ہوائی جہاز منڈلاتے رہتے، بمباری کا خطرہ ہوتا اور سرحد سے توپوں کی گھن گرج برابر سنائی دیتی، جاری رہی۔ کچھ دوستوں نے اس اجتماع کو اس زمانے میں ''وار کونسل'' کا نام دے دیا۔ اخلاق صاحب اسی طرح سائیکل پر سوار سولہ ہیٹ سمیت روزانہ آتے مگر اس پندرہ بیس برس کی مدت میں، ان محفلوں میں انھوں نے اپنی ذات یا اپنی کسی ذاتی پریشانی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اگر انتظار حسین انھیں اپنے بچپن کی یادوں کے بارے میں، مشرق میں ہفتہ وار کالم لکھنے پر مجبور نہ کرتے اور اگر ان کے یہ کالم ان کے انتقال سے چار پانچ ماہ قبل کتابی شکل میں شائع نہ ہو جاتے تو اتنے قرب کے باوجود ان کے بارے میں مجھے بھی کچھ زیادہ پتہ نہ چلتا۔

مجھے یہ تو پتہ تھا کہ انھوں نے فقہ مفتی کفایت اللہ سے پڑھی تھی۔ باتوں باتوں میں وہ یہ بھی بتا چکے تھے کہ درس فقہ کے دوران وہ مفتی صاحب کو بہت زچ کرتے تھے، مثلاً جب مفتی صاحب نے پردے کی شرعی حیثیت کے بارے میں بتایا کہ از روئے شریعت عورتوں کے لیے زینت کے مقامات کو چھپانا ضروری ہے تو اخلاق صاحب نے کہا کہ پھر تو نہانے کا لباس مسلمان عورتوں کا شرعی لباس ہوا۔

مفتی صاحب نے کہا، ''بات تو ٹھیک ہے مگر یہ باتیں باہر جا کر کرنے کی نہیں ہیں۔'' اس قسم

کے چٹکلے تو وہ سناتے رہتے تھے مگر ان کے نو دس برس کی عمر میں قرآن حفظ کرنے اور پھر رمضان شریف میں قرآن سنانے کی بات ان کی کتاب پڑھ کر ہی معلوم ہوئی۔ مجھ سے ان کی بے پایاں شفقت اور محبت کی وجہ بھی اب سمجھ میں آئی کہ ان کے اور میرے درمیان بہت سی باتیں مشترک تھیں، مثلاً میں نے بھی اسی عمر میں قرآن حفظ کیا اور رمضان شریف میں تراویح پڑھائیں، یہ دوسری بات ہے کہ میں نے گاؤں کی مسجد میں قرآن سنایا تو میرے گھر والے اور گاؤں کے غریب ترین لوگ میرے مقتدی تھے جبکہ اخلاق صاحب نے قرآن دہلی کی جامع مسجد میں سنایا اور اس تقریب میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا سعید اور خواجہ حسن نظامی جیسے مشاہیر شریک ہوئے۔ اخلاق صاحب کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی عمر تین برس تھی، میرے والد کا انتقال ہوا تو میں بھی تین برس کا تھا۔ ہماری باہمی محبت اور یگانگت کی وجہ شاید یہ بھی ہو۔

کوچہ چہل امیراں یا کوچہ چیلان کے رہائشی زبان اور تہذیب کے معاملے میں اپنے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے۔ اودھ تو دور کی بات ہے دہلی کے دوسرے محلوں کے لوگ بھی سند نہیں مانے جاتے تھے۔

اخلاق صاحب اسی محلے کے پشتنی رہائشی تھے، ان کے محلے داروں اور پڑوسیوں میں آصف علی، مولانا احمد سعید، عارف ہسوی، ملا واحدی، حضرت جالب، علامہ راشد الخیری، مرزا فرحت بیگ، مفتی کفایت اللہ اور پروفیسر مرزا محمد سعید آئی ای ایس شامل تھے اور یہ سبھی سات پشتوں سے دہلی کے کوچہ چہل امیراں کے باسی تھے۔ البتہ مولانا محمد علی اور شوکت علی باہر یعنی رام پور سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان کا کامریڈ پریس بھی یہیں تھا۔ کیسے کیسے باکمال لوگ اس جگہ رہتے تھے۔ بنوٹ کے ماہر نگینہ ساز، جیب تراش، نقب زن، زبان دان شاعر سبھی اپنے فن میں یکتا تھے۔ دہلی کا یہ محلّہ اس صدی کے اوائل میں بھی مغل سلطنت کی باقیات کا عکس نظر آتا تھا۔ اخلاق صاحب کی پرورش انہی لوگوں کی صحبت میں ہوئی۔

بہادر شاہ ظفر کی ایک پوتی جس نے غدر کے زمانے میں جان بچا کر ان کے گھر میں پناہ لی اور زندگی کی آخری سانس اسی گھر میں لی۔ دس برس کی عمر تک جب وہ رخصت ہوئیں اخلاق صاحب انہی کی گود میں کھیلے چنانچہ اس شہزادی نے نو دس برس کی عمر تک انھیں برفی اور بالائی پر پالا۔ روٹی بھی بالائی کے ساتھ کھلاتی رہیں۔ وہ سالن اور نمک مرچ کی لذت سے شہزادی کی وفات کے بعد ہی آشنا ہوئے اور اس کے لیے انھیں اپنی ایک خالہ کے پاس جا کر رہنا پڑا۔ اخلاق

صاحب کی زبان کی مٹھاس کی وجہ شاید یہی تھی۔ ان کے بچپن میں ان شہزادی صاحبہ سے قلعے کی باتیں سننے کے لیے ان کے گھر میں باقاعدہ آنے والوں میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جیسے لوگ شامل تھے۔ آصف علی کے ہمراہ ایک دو دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ نظامی بھی آئے۔ کوچہ چہل امیراں کی کیکر والی مسجد میں اخلاق صاحب موذن کے فرائض انجام دیتے رہے اور نماز بھی پڑھاتے رہے اور ان کے اقتدا میں نماز پڑھنے والوں میں مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیات شامل تھیں۔ میں نے بھی دو برس تک اذان دینے اور نماز پڑھنے کا فریضہ اپنے گاؤں میں انجام دیا۔ یہ بھی ان سے ایک طرح کی مناسبت تھی۔

ایسی ہی ایک محفل میں جب بیگم صاحبہ نے کسی لفظ پر ٹوکا تو حکیم اجمل خاں نے اپنے بیان کی تائید میں داغ کو سند کے طور پر پیش کیا۔ اس پر اخلاق صاحب کے بیان کے مطابق شہزادی صاحبہ نے کہا ''حکیم صاحب داغ آپ کے لیے سند ہوگا میرے لیے تو وہ لونڈی بچہ تھا، سند پیش کرنی ہے تو بہادر شاہ ظفر یا استاد ذوق کی پیش کیجیے۔''

اسی ماحول میں پرورش پانے والے اور ایسے اصحاب علم کے درمیان بچپن گزارنے والے کی زبان کتنی صحیح اور شیریں ہو سکتی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ اگر آواز کی سطح ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا تو اخلاق صاحب کی آواز و لہجے کی یکسانیت کے بارے میں حیرت انگیز نتائج سامنے آتے۔ ان کے لہجے کا ٹھہراؤ آواز کا حجم اور مٹھاس جس نسبت سے پہلے دن سننے میں آئی آخری سانس تک اسی سطح پر برقرار رہی۔ جتنا اونچا بولنے کے وہ عادی تھے اس سے بلند آواز میں انھوں نے زندگی بھر کبھی بات نہیں کی۔

....

لاہور ہوٹل کے عقب میں دو کمرے کے ایک مکان میں برسوں بود و باش رکھنے والا، ایک ہی لباس یعنی تنگ موری کا پائجامہ، کھدر کا کرتہ، سر پر سولر ہیٹ اور سائیکل پر سوار جو شخص روزانہ اس محلے سے نکل کر ریڈیو پاکستان، وہاں سے رائل پارک بیڈن روڈ اور ریگل سینما کے چکر لگاتا تھا اس کے بارے میں آس پاس رہنے والے یا اسے روزانہ دیکھنے والوں کو کیا معلوم کہ وہ کس سرزمین سے اٹھ کر آیا تھا۔ اس کی شخصیت کا، اس کا پس منظر کیا ہے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ چالیس کے عشرے کے اوائل میں جب گزٹیڈ افسروں کا مشاہرہ تین ساڑھے تین سو روپے ماہوار ہوتا تھا اخلاق احمد دہلوی کو آل انڈیا ریڈیو سے ملنے والی تنخواہ کے علاوہ گھر سے پانچ سو روپے ماہوار جیب خرچ ملا کرتا تھا۔ دہلی کے بڑے ہوٹل، مے خانے اور ریستوراں ان کی دسترس میں تھے۔ ان کی

کمپنی میں ریڈیو کے اناؤنسروں کے علاوہ مجاز، میرا جی، ن م راشد اور کرشن چندر جیسے اہل قلم شامل تھے۔ پیسہ بھی تھا، علم بھی تھا، قرآن حفظ کرنے اور فقہ پڑھنے کے بعد انھوں نے بے خود دہلوی سے غالب کی شرح پڑھی، انھی کے ساتھ چھمیا یعنی شمشاد بائی، پری چہرہ نسیم بانو کی ماں اور سائرہ بانو کی نانی کے ہاں غزل کی گائیکی کے اسرار و رموز سے آشنا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد خواجہ حسن نظامی کے انگریزی پرچے کے ایڈیٹر بنے، بابائے اردو کے ساتھ میرٹھ کی نوچندی کے موقع پر مجرا سننے جاتے رہے (اس وقت تک ایسی طوائفیں زندہ موجود تھیں جن کے ہاں شرفاء کے بچے تہذیب کا سبق سیکھنے جاتے تھے)۔ قائداعظم، لیاقت علی خاں، اور سردار عبدالرب نشتر سے انٹرویو کیے۔ بابائے اردو اور شان الحق حقی کے والد مولوی احتشام الدین کے جو علم کے سمندر کا درجہ رکھتے تھے، ساتھ برسوں اردو کی لغت پر کام کیا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق اٹھارہ بیس برس کی عمر میں انھیں اردو کے لاکھ ڈیڑھ لاکھ اشعار زبانی یاد تھے۔ کیا ٹھاٹھ ہوں گے ایسے آدمی کے، وہ محفلوں کی جان اور دوستوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ مولوی عبدالحق نے ابتدا میں انھیں زیادہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے کام دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا، انھیں اصل دہلی والا زبان دان چاہیے۔ اتنی کتابیں پڑھنے کے بعد جتنی اخلاق نے پڑھ رکھی ہیں لوگ دوسروں کی زبان بولنے لگتے ہیں۔

وہ اپنے عزیز اور سرپرست شاہد احمد دہلوی اور کچھ دوسرے اہم لوگوں کے ساتھ مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور آئے جس میں قرارداد پاکستان پیش اور پاس ہوئی مگر انھوں نے کسی سے کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا، نہ ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ یہ سب کچھ میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ دیکھنا چاہیے کہ اس حیثیت اور یہ علمی پس منظر رکھنے والا آدمی جب پاکستان آ کر آباد ہوا تو اس نے زندگی کے آخری پینتالیس برس اس ملک میں کیسے گزارے۔ ہم نے ان کی زبان سے برسوں نہ تو بچپن کی شاہانہ زندگی کا ذکر سنا اور نہ کبھی اپنے صاحب علم ہونے کا ذکر انھوں نے کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ علم چھپتا نہیں ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے قریبی دوستوں کو ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا گیا۔ بھلا جو آدمی انیس بیس برس کی عمر میں، بھری محفل میں جگر مراد آبادی کو ان کے مطلع کے دوسرے مصرعے میں موجود سقم کی نشاندہی کی جرأت رکھتا ہو اور جگر صاحب کو ادیبوں کے بھرے مجمعے میں اس کی اصلاح قبول کرنی پڑی ہو زبان کے علم اور اس کی شعر فہمی پر کون ایمان نہ لائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی اور ریڈیو پاکستان لاہور کی 38 سالہ مدتِ ملازمت میں وہ اناؤنسمنٹ کرنے کے علاوہ باقاعدگی سے خطوں کے جواب دیتے اور مشاعروں کی کمپیئرنگ کرتے رہے۔ الفاظ کی نشست و

برخواست، صحت لفظی اور شعر فہمی کے سلسلے میں ہمارے جیسے لوگ ہمیشہ ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔

اخلاق احمد دہلوی نے حصول علم اور تہذیب و شائستگی کے انداز سیکھنے کے علاوہ بہادری، بغاوت، سرکشی، زندہ دلی اور شوریدہ سری کے سارے کام ستائیس اٹھائیس برس کی عمر میں اپنے قیام دہلی تک پورے کر لیے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد دہلی والے پرانے اخلاق احمد نے ایک ہی کارنامہ انجام دیا تھا، یہ تھا ان کی شادی کا معاملہ۔ دوستوں، عزیزوں اور اقربا کی شدید مخالفت کے باوجود انھوں نے ایک ایسی خاتون سے شادی کرنے کا اعلان کیا جو آٹھ دس برس سے اپنی عمر سے تیس سال بڑے ایک معذور اندھے اور بہرے شخص کی بیوی بن کر زندگی کے دن پورے کر رہی تھی اور جس کے متعلق ان کی بہن سے جس کے ہاں وہ دلی کے فسادات کی وجہ سے عارضی طور مقیم تھے انھیں یہ معلومات حاصل ہوئی تھیں کہ اصل میں اس قبول صورت لڑکی کو دو خاندانوں کے وقار کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ یہ خاندان نظیر اکبرآبادی کی پڑپوتی اور اس کا برائے نام شوہر اسمٰعیل میرٹھی کا نواسا تھا۔ اس خاوند کو بھی یہ احساس تھا کہ وہ اور اس کے اہلِ خاندان اس خاتون پر ظلم کر رہے ہیں۔ اتفاق سے یہ بات جب اس کے کانوں تک پہنچی تو وہ خود فوراً طلاق دینے پر رضامند ہو گیا۔ مگر اخلاق صاحب کے اہل خانہ اور دوست اس کے باوجود اس شادی کے حق میں نہ تھے، کچھ قریبی دوست ان کے مددگار ہوئے تو 1948 میں یہ شادی لاہور میں انجام پائی۔ شادی سے قبل اسی خاتون کے پہلے سسرالیوں کی طرف سے اخلاق صاحب کو جان سے مار ڈالنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔

یہ شادی بس وہ آخری کام تھا جس میں پرانے جی دار اخلاق احمد کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس کے بعد تو جیسے انھوں نے جوگ لے لیا، پرانی زندگی، پرانے رشتے ناطے، پرانی عادتیں سبھی کچھ ختم ہو گیا۔ والد صاحب سے سوتیلی والدہ کی وجہ سے زیادہ خوشگوار تعلقات تو پہلے بھی نہیں تھے اور ان کا بچپن زیادہ تر اپنی نانی کے سائے میں گزرا۔ پاکستان میں یہ خاندان چونکہ ایک ساتھ آیا تھا اور ایک ساتھ ہی ایک بے در و دیوار مکان میں کچھ مہینے اچھرہ اور مسلم ٹاؤن کے درمیان مقیم رہا اس لیے کچھ دنوں کے لیے یہ تعلقات معمول پر آ گئے۔ ان کی شادی کے بعد والد ناراض ہو کر کراچی چلے گئے، پھر جنگل والے اس بے در و دیوار گھر میں ایک برس سے زائد ابوالخیر اور ان کی والدہ بھی رہائش پذیر رہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد 51-1950 میں اخلاق صاحب لاہور ہوٹل کے عقب میں پچیس روپے ماہوار کے ایک مکان میں اٹھ آئے اور برسوں اس میں مقیم

رہے۔ ایک وجہ اس معمولی سے مکان میں آنے کی یہ بھی تھی کہ جہاں انھیں 1947 میں دہلی ریڈیو سٹیشن سے ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور یہ سٹیشن انھیں پاکستان منتقل ہونے سے روکنے کے لیے آٹھ سو ماہوار کی پیشکش کر چکا تھا، ریڈیو پاکستان لاہور نے ان کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے زیادہ دینے سے معذوری ظاہر کی۔ انھیں اور کوئی کام آتا ہی نہیں تھا، آٹھ نو برس سے ریڈیو ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اس لیے مجبوراً ان کو یہ تنخواہ قبول کرنا پڑی، اب ڈیڑھ سو روپے میں مکان کی مد میں بیس پچیس روپے سے زیادہ صرف کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اس پر ایسے قانع ہوئے کہ زندگی کا ڈھب ہی بدل لیا۔ گھر، ریڈیو، سائیکل، سولر ہیٹ، دوستوں کی محفل اور بس۔ تنگدستی کی شکایت انھوں نے کبھی نہیں کی، البتہ ایک دفعہ ایک انٹرویو کے دوران کسی نے ان سے سوال کیا آپ کی سب سے بڑی آرزو کیا ہے؟''

''ایک فالتو تنخواہ۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''وہ کس لیے؟''

''اس لیے کہ عام طور سے ہماری تنخواہ تین چار تاریخ تک ختم ہو جاتی ہے، پھر ادھار چلتا ہے ایک فالتو تنخواہ مل جائے تو سارے قرضے ادا کرنے کے بعد مہینے کے آخر تک کچھ پیسے تو جیب میں رہیں گے۔''

کہا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں ان کے والد صاحب نے کراچی سے انھیں خط لکھا کہ معلوم ہوتا ہے ان کا آخری وقت آ گیا ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر حساب دینا ہے اس لیے بہتر ہے اخلاق کراچی آ کر ان سے مل بھی لیں اور خاندانی وراثت میں اپنا حصہ بھی جو چالیس ہزار روپے بنتا ہے لے جائیں۔

اخلاق صاحب کراچی نہیں گئے، والد کو ایک کارڈ لکھ دیا جس میں تحریر تھا کہ ''آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر آپ کو صرف روپوں پیسوں کا حساب دینا پڑے گا۔ یہ جو آپ نے اتنے برس مجھے اپنی شفقت سے محروم رکھا، اس کا حساب کون دے گا اور چونکہ آپ نے مجھے اپنی شفقت کے قابل نہیں سمجھا اس لیے مجھے خاندانی وراثت کا یہ حصہ نہیں چاہیے۔''

لاہور ہوٹل کے عقب میں شاہ ابوالمعالی کے مزار کے آس پاس یہ خاندان پندرہ بیس برس مقیم رہا۔ ان کے اکلوتے بیٹے نے یہیں رہتے ہوئے ایم اے کیا اور سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے یہیں سے حکومت پاکستان کا اعلیٰ عہدیدار بن گیا۔ ان میاں بیوی کے درمیان جیسی محبت اور قربت رہی اسے مثالی ہی کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ ایک جان دو قالب کی ترکیب کے معانی انھیں کو

دیکھ کر سمجھ میں آئے۔ شاید وہ دنیا کے واحد میاں بیوی تھے جن کے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ بیگم اخلاق محلے کی مقبول ترین خاتون تھیں۔ ساری دنیا کا درد ہمارے جگر میں ہے کی زندہ مثال۔ آس پاس کے لوگ، عورتیں، بچے، بوڑھے اپنے اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتے۔ بیگم کے ساتھ ساتھ اخلاق صاحب بھی ہر کسی کی دادرسی کے لیے تیار رہتے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ ان کے ایک پڑوسی کے ہاں کوئی مر گیا تو وہ جگہ کی قلت کی بنا پر میت ان کے صحن میں رکھ گیا۔ کوئی بیمار ہے، کسی کی نوکری جائے، کسی کے پاس کھانے کو نہیں، بیگم اخلاق ہر کسی کے کام آتیں۔ یہ دو فرشتے تھے جن کی طرف پورے محلے کی نظریں لگی رہتیں۔ اس کس مپرسی اور تنگ دستی کے عالم میں دوستوں کی دعوتیں بھی ہوتیں۔ لوگوں کی مدد بھی جاری رہتی، گھر میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ چار پائیاں، چند کرسیاں اور ایک تخت جس پر چاندنی بچھی رہتی اور گاؤ تکیے پڑے ہوتے۔ ابتدائی زمانے میں اے حمید بھی پاس ہی رہتے تھے۔ ان کی بیگم ریحانہ ان کے ہاں روزانہ آنے والوں میں تھی۔ سمن آباد میں وہ پڑوسی بن گئے، ریحانہ تو ان کے ہاں باقاعدہ جاتی مگر اخلاق صاحب نے مجھ سے اے حمید کی کئی بار شکایت کی کہ وہ ملنے نہیں آتا۔ پھر خود ہی کہتے بس ان کی عادت ہی ایسی ہے۔ بیگم اخلاق نے جب وہ شاہ ابوالمعالی میں رہتی تھیں ایک طوطا بھی پال رکھا تھا۔ ملنے جلنے والوں سے وہ گھنٹوں اس کی خصوصیات پر باتیں کرتیں۔ طوطا کہیں بیمار پڑ جاتا تو بیگم کے ساتھ اخلاق صاحب بھی اعصابی دباؤ کا شکار ہو جاتے۔

اس زمانے میں وہ روزانہ ریگل میں میرے دفتر آنے لگے تھے، ان کی باتوں سے جی بہت خوش ہوتا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے اور شگفتہ زبان میں وہ شعر و ادب کے موتی بکھیرتے، کٹھ ملاؤں کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے، سیاسی معاملات پر پریشان بھی دکھائی دیتے، دنیا بھر کا ذکر ہوتا مگر ان تیس پینتیس برس میں انھوں نے کبھی بھولے سے بھی اپنی کسی ذاتی محرومی کا ذکر نہیں کیا، ان کے آس پاس لوگ بھاگے پھر رہے تھے، کسی بھی قیمت پر دولت پیدا کرنے کی ہوس نے عفریت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لاہور کی سڑکیں جہاں اکا دکا کاریں نظر آتی تھیں موٹروں سے بھر گئیں مگر اخلاق صاحب کی سائیکل تھی اور وہ تھے۔ جب سڑکیں سائیکلوں کے لیے تنگ ہو گئیں تو یہ سائیکل ان کے ہاتھ میں رہتی۔ آخری چند برس لاہور سے کوئٹہ جانے تک وہ سائیکل پر سوار کم نظر آتے البتہ ہاتھ میں ضرور رکھتے۔ کوئٹہ اور کراچی سے واپسی کے بعد ان کی بینائی کم ہو گئی تھی اور آسانی سے چل بھی نہیں سکتے اس لیے سائیکل چھوڑ دی۔ وہ بدلتی ہوئی دنیا سے بے خبر آخر تک اپنی ہی دنیا بسائے رہے۔ جو کچھ بھی ان کے پاس تھا اس پر قانع تھے ہاں البتہ ان کی باتیں ویسی ہی تھیں،

شیریں مٹھاس اور رس میں گھلی ہوئیں۔ کسی استاد کا شعر سن کر اس کے درجنوں اشعار سنا دیتے۔ کس موقعہ پر کس شاعر نے کون سا شعر کہا تھا، کس طوائف نے کس شاعر سے شعر کی فرمائش کی اور قیمت طلب کرنے میں پان کی گلوری پیش کی تو شاعر نے فی البدیہہ کون سے اشعار کہے، انھیں یہ سب یاد ہوتا۔

اخلاق صاحب بڑے سے بڑا فقرہ بڑے آرام سے کہہ دیتے، 1965 کی جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد جب مجھ پر ریڈیو کے دروازے عارضی طور پر کھلے تو میں ہر مہینے ہفتے بھر کے لیے خبروں پر تبصرہ ریکارڈ کرانے ریڈیو اسٹیشن جاتا۔ ان سے وہاں زیادہ ملاقاتیں رہیں۔ ریگل کی محفل کے علاوہ بھی کچھ وقت ریڈیو پر ان کے ساتھ گزرتا۔ ایک روز میں ڈیوٹی روم میں ان کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ایک نہایت خوبرو خاتون ایک بہت خوفناک مونچھوں والے آدمی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اخلاق صاحب سے کچھ پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا اور وہ دونوں چلے گئے۔ اس کے جانے کے بعد کہنے لگے، ''حمید اختر صاحب یہ ممتاز ہے، گاتی بھی اچھا ہے اور خوش شکل بھی ہے۔''

''اس کے ساتھ کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''محافظ، جیسا کہ اس محلّہ سے آنے والیوں کے ساتھ ہمیشہ ہوتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد بولے ''بھئی یہ ممتاز ہمیں بہت پسند ہے، اس سے دوستی کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

''دیر کس بات کی ہے، بسم اللہ کیجئے۔'' میں نے کہا۔

''کیا کریں بھائی، وہ اس کا دولتانہ جو ساتھ لگا ہوا ہے، اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

ایسے ہی چھوٹے چھوٹے جملے وہ بڑے آرام سے بول دیتے، تحریر میں بھی ایسی ہی شگفتگی تھی، 1980 میں کوئٹہ سے مجھے خط لکھا، میں نے وہاں سے کچھ منگوانے کی فرمائش کی۔ ان کا جواب فوراً آیا کہ مطلوبہ چیزیں ایک دو روز میں پارسل کر دوں گا۔

دو تین روز بعد دوسرا خط آیا لکھا تھا ''چیزیں ملنے میں دیر ہوگئی اس لیے پارسل نہ کر سکا اب ایک دو روز میں زمرد صاحب لاہور آ رہے ہیں، یہ آپ کو آپ کا سامان دستی بلکہ زبردستی پہنچا دیں گے۔''

جنوری 1985 میں میری دوسری بیٹی ہما کی شادی پر آئے۔ اس روز غضب کی سردی تھی اور اخلاق صاحب کو سردی کا موسم سخت ناپسند تھا، ملتے ہی کہنے لگے، ''اس سے تو بہتر تھا آپ سائبریا

میں جا کر شادی کا انتظام کرتے۔"

1981 میں جب میں بڑی بیٹی صبا کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا تو کہنے لگے "آپ کو دہلی کے ایک پکوّے کا پتہ دیتے ہیں کھانا اس سے بنوائیے۔"

میں نے کہا پتہ کیا بتا رہے ہیں، چلیے ابھی جا کر طے کر لیتے ہیں، مجھے ساتھ لے کر روانہ ہوئے راستے میں کہنے لگے، "آپ کے جتنے مہمان ہیں پکوّے کو ان کی تعداد نصف کر کے بتایئے۔"

"یہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"دہلی والے مہمانوں کی تعداد دوگنی کر کے کھانے کی مقدار متعین کرتے ہیں۔" انھوں نے کہا۔

مجھے وہ ایبک روڈ پر لے گئے اور اصرار کر کے مہمانوں کی تعداد کم بتائی، اس کے باوجود بہت سا کھانا بچ گیا۔ کھانا واقعی ایسا لذیذ تھا کہ اس شادی کے شرکاء آج تک یاد کرتے ہیں۔

یہ بھی اتفاق ہے کہ ریڈیو کی 38 سالہ ملازمت کے بعد اخلاق صاحب 1979 میں ریٹائر ہوئے۔ میں بھی 27 برس کی ملازمت کے بعد اسی سال زیڈ اے سلہری صاحب کی مہربانی سے روزنامہ امروز سے جبری طور پر ریٹائر کر دیا گیا۔ اب ہم دونوں گویا پوری طرح فارغ تھے۔ اخلاق صاحب کو چند ہزار روپے گریجویٹی کے ملے۔ سٹاف آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے پنشن کے حق سے محروم رہے مگر انھوں نے اس کی شکایت کی نہ کبھی پریشانی کا اظہار کیا البتہ ریڈیو سے علیحدگی ان کے لیے سوہان روح تھی۔ وہ سرتا پا ریڈیو کے آدمی تھے اور اس زمانے میں (1941ء) اس سے وابستہ ہوئے جب ریڈیو کی بڑی اہمیت تھی اور ریڈیو والے معاشرے میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ وہ زندگی بھر بی بی سی اور وائس آف امریکہ باقاعدگی سے سنتے رہے۔ ریگل کی محفل کے پچیس تیس برس میں انھوں نے متعدد بار بی بی سی اور وائس آف امریکہ کے صبح کے بلیٹن کی خبریں سنائیں جو اخبارات میں اگلے دن شائع ہوئیں اس لیے ریڈیو سے 38 سالہ وابستگی کے بعد جس کے دوران میں ان کا برصغیر کے بڑے مشاہیر سے واسطہ رہا اس تعلق کے ختم ہونے کا انھیں بہت قلق تھا۔ برصغیر کی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان ہوا تو اس وقت وہ ڈیوٹی پر تھے۔ وہاں انھوں نے وائسرائے ہند، پنڈت جواہر لال نہرو، قائداعظم محمد علی جناح اور ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ جس طرح اپنے فرائض انجام دیے، اس کی دلچسپ روداد انھوں نے اپنی کتاب "یادوں کے سفر" میں تفصیل سے بیان کی ہے بلکہ پنڈت جی کی تقریر کا اردو ترجمہ پڑھنے کی ڈیوٹی انہی کی تھی۔ ظاہر

ہے کہ اتنی بھر پور ریڈیائی زندگی گزارنے کے بعد فارغ ہو کر گھر بیٹھ جانا انھیں اچھا نہیں لگا مگر یہ ہمارا اندازہ ہی ہے۔ انھوں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ تنخواہ بند ہونے اور پنشن نہ ملنے کی وجہ سے جن مالی مشکلات کا سامنا انھیں کرنا پڑا اس کا ذکر بھی انھوں نے کسی سے نہیں کیا۔ ان کا بیٹا عینی اس وقت کوئٹہ میں تعینات تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دو گھروں کے اخراجات کا بار اٹھانے کی بجائے بہتر ہے کہ اخلاق صاحب اور اس کی والدہ کوئٹہ آ جائیں۔ ہم نے بھی اس کی تائید کی۔ اخلاق صاحب لاہور بالخصوص اپنا وہ محلہ جس میں بیس برس سے آباد تھے چھوڑنے کو تیار نہ تھے مگر کرتے کیا اور کھاتے کہاں سے۔ دل پر پتھر باندھ کر وہ گھر چھوڑا۔ ان کی بیگم نے تقریباً تمام سامان اڑوسیوں پڑوسیوں میں بانٹ دیا اور یہ لوگ کوئٹہ چلے گئے۔ کسی وجہ سے بیگم اخلاق کا طوطا ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ اب ہر خط میں طوطے کا ذکر اور بیگم کی پریشانی مذکور ہوتی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب پی آئی اے میں ان کی ایک عزیزہ روبی (اب ان کی بہو) نے بالآخر یہ طوطا کوئٹہ پہنچایا تو خط میں اس کے کارنامے کا بطور خاص ذکر کیا۔ یہ خط 13 / اکتوبر 1980 کو بولان ہوٹل کوئٹہ سے لکھا گیا۔

حمید اختر صاحب! کمال ہو گیا۔ آج آپ کا گیارہ اکتوبر کا خط مل گیا۔ آج ہی مکتبہ عالیہ والوں کا یکم اکتوبر کا لکھا ہوا خط ملا۔ طوطے کا کام روبی نے ایک جست میں کر دیا۔ یعنی جمعہ کو وہ کراچی سے عظمیٰ کو لاہور میں اور ہمیں یہاں کوئٹے میں ٹیلی فون پر اطلاع دے کر چلی کہ میں شام کو طوطا لے کر کوئٹہ پہنچ رہی ہوں اور طوطا جمعہ کی شام کو ہمیں پہنچا کر، ہفتے کی صبح کو کراچی پہنچ گئی واپس اور یہ سب کام اس نے بائیں ہاتھ سے کیا۔ کیا کمال کی یہ لڑکی ہے۔ اسی طرح ابھی کچھ دن پہلے ہمارے ایک عزیز کو اس نے تھائی لینڈ میں جا کر آسٹریلیا کا ویزا دلایا جو ناممکن تھا۔"

کوئٹہ سے عینی کا تبادلہ کراچی کاٹن بورڈ کے سیکرٹری کے طور پر ہوا تو اخلاق صاحب بھی کراچی منتقل ہو گئے، کراچی میں نسبتاً زیادہ ناخوش رہے۔ کوئٹہ میں زمرد حسین مرحوم اور مجتبیٰ حسین مرحوم ان کی بہت ناز برداریاں کرتے رہے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ زمرد حسین روزانہ کار میں مجھے کوئٹے کے آس پاس بیس تیس میل کی سیر کراتے ہیں۔ جہاں کہیں چڑیاں بولتی نظر آتی ہیں مجھے سنواتے ہیں اور کہتے ہیں اب تو لاہور کو بھول جایئے۔ بہت خاطر کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین تو ادب کے آدمی تھے اس لیے ان کے بہت مطلب کے آدمی ثابت ہوئے اور ان سے بہت صحبتیں رہیں، کراچی میں وہ بالکل سیٹ نہیں ہوئے۔ عینی کاٹن بورڈ کے کام سے ناخوش تھے۔ اخلاق صاحب کی تربیت کا جو ساری کی ساری بالواسطہ تھی کہ انھوں نے اسے کبھی کسی کام سے ٹوکا ہی نہیں تھا یہ اثر تھا کہ وہ غلط کام نہیں کرتا تھا۔ کاٹن بورڈ میں ناقص کپاس پاس کرانے کے لیے رشوت کا

بازار گرم تھا، وہ یہ نہیں کرسکتا تھا۔ حتیٰ کہ گورنر کی سفارش پر بھی اس نے ناقص کپاس کو سرٹیفکیٹ نہیں دیا۔ وہاں کافی کشیدگی پیدا ہوگئی۔ چند ہی ماہ بعد حکومت کے متعلقہ افسروں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کی پوسٹنگ سری لنکا میں پاکستانی سفارت خانے کے کمرشل اتاشی کے طور پر کرادی۔ اخلاق صاحب اس کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا تھا ہم واپس اپنے وطن، لاہور جائیں گے۔

دو اڑھائی برس کی جلاوطنی کے بعد اخلاق صاحب لاہور آ گئے، وہ پرانا مکان تو نہ مل سکا البتہ سمن آباد میں دوسری منزل پر دو کمرے کا مکان مل گیا۔ مکان دار بھی ان کا کوئی قدر دان اور غالباً دہلی کے پنجابی سوداگران میں سے تھا۔ وہ آخر دم تک اسی مکان میں رہے، مجھے اب یاد نہیں کہ قیام کراچی کے آخری دنوں میں شاید لاہور آنے کے بعد پہلی بار ان پر بیماریِ دل کا حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے بہت سے پرہیز بشمول سگریٹ ترک کرنے کے بتائے۔ انھوں نے ڈاکٹروں کی کوئی بات نہیں مانی۔ اصل میں زندہ رہنے یا زندگی کرنے کا ان میں کوئی ولولہ باقی نہیں تھا۔ وہ سگریٹ بھی پیتے رہے۔ غذا بھی معمول کے مطابق کھاتے رہے۔ بیٹے کو تین برس تک اپنی بیماری سے آگاہ نہیں کیا۔ میری خواہش تھی وہ کولمبو چلے جائیں اور زندگی کے آخری مہ و سال بیٹے کے ساتھ آرام سے گزاریں مگر وہ نہیں مانے، انھیں اپنی درویشانہ بلکہ قلندرانہ زندگی زیادہ پسند تھی۔ ایک روز وہ ریگل آئے تو میں نے کہا میں عینی کو آپ کی بیماری کے بارے میں خط لکھ رہا ہوں، کہنے لگے، ''نہیں وہ خواہ مخواہ پریشان ہوگا۔''

مجھ میں یہ ہمت نہیں تھی کہ میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کروں، خواہش اور ارادے کے باوجود میں نے عینی کو خط نہیں لکھا۔ بعد میں ان سے ایک دو بار کہا کہ وہ کولمبو کیوں نہیں چلے جاتے مگر انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ''اب مجھے لاہور نہیں چھوڑنا'' اپنی زندگی کے بارے میں انھوں نے شاید کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے جو کچھ کرنا تھا دہلی ہی میں کر آئے۔ 28 برس کی عمر میں لاہور آنے کے بعد وہ بالکل تاریک الدنیا ہو گئے تھے، نہ ان کی کوئی ذاتی خواہش تھی، نہ انھوں نے کبھی ذاتی مکان بنانے کے بارے میں سوچا، نہ انھیں اپنی مالی پریشانیوں کی کوئی فکر تھی۔ ان کا تہ دڑا بہت مزاج دان ہونے کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں، انھوں نے پاکستان آنے کے بعد سوچا ہوگا کہ دلی اور کوچہ چہل امیراں اب یہاں دوبارہ ہاتھ نہیں آ سکتا اور جب وہ سب کچھ نہیں ہے وہ جو وہ چھوڑ آئے ہیں تو پھر کچھ بھی نہیں ہے،۔ بس جس طرح گزر رہی ہے ٹھیک ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انھوں نے دوسرے مہاجروں کی طرح دوبار دلی جانے کی

خواہش کا اظہار بھی کبھی نہیں کیا۔

کولمبو سے واپسی کے بعد عینی کی پوسٹنگ اسلام آباد ہوگئی اور وہاں جانے سے پہلے چھٹی لے کر ڈیڑھ ماہ لاہور میں رہا، لاہور میں اسے سواری کی دقت پیش آ رہی تھی۔ اخلاق صاحب کے بنک میں جو چند ہزار روپے پڑے تھے سب نکلوا کر اسے دے دیے موٹر خریدنے کے لئے۔ کچھ پیسے اس کے پاس تھے، اس نے چھوٹی سوزوکی خرید لی۔ یہ گاڑی پندرہ بیس روز ان کے پاس رہی۔ اس میں وہ تین دفعہ عینی کے ہمراہ ریگل بھی آئے۔ دوسرے دوستوں کے پاس بھی ملنے جاتے رہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ زندگی میں پہلی بار وہ موبائیل ہوگئے ہیں اور اپنی مرضی سے بیٹے کے ساتھ جہاں چاہے جا سکتے ہیں مگر تین یا چار ہفتوں کے بعد یہ کار ان کے گھر کے باہر سے جہاں رات کو یہ سڑک پر پارک کی جاتی تھی، چوری ہوگئی اور اب تک نہیں ملی۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے اس نقصان کی بھی پروا نہیں کی۔ گاڑی کی بازیابی کے بارے میں ان سے پوچھا جاتا تو ہمیشہ مایوسی کا اظہار کرتے، اپنی آخری پونجی لٹ جانے پر بھی انھوں نے عام فانی انسانوں کی طرح واویلا نہیں کیا۔ پہلے دن سے وہ یہی کہتے رہتے کہ ''چھوڑیے گاڑی اب کہاں سے ملے گی، گئی سو گئی۔''

عینی کی شادی کے بارے میں وہ خاصے فکرمند رہتے مگر اس کا کہنا تھا کہ تنخواہ میں کرایہ کے مکان میں رہائش رکھنے کے بعد خود اس اکیلے کا گزراہ نہیں ہوتا تو وہ بیوی کو کیا کھلائے گا؟ اخلاق صاحب اس سے متفق تھے۔ کراچی کے قیام کے دوران میں عینی نے اسی پی آئی اے والی لڑکی سے جوان کا طوطا کوئٹہ لے کر گئی تھی اور ان کی بیگم کی قریبی عزیز تھی شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ جب اس نے اخلاق صاحب سے بات کی تو وہ کراچی سے ٹرانسفر ہو کر آسٹریلیا جا چکی تھی، عینی اسلام آباد میں تھا اور ملازمت سے خاصا بددل تھا اس نے کچھ دوستوں کے تعاون سے طویل رخصت لے کر کاروبار کے لیے آسٹریلیا جانے کی خواہش ظاہر کی تو اخلاق صاحب نے فوراً ہی اجازت دے دی۔ وہاں انھوں نے شادی بھی کر لی۔ سال ڈیڑھ سال بعد یہ دونوں میاں بیوی کچھ وقت کے لیے لاہور آئے تو اخلاق صاحب نے ان کی شادی کی باقاعدہ دعوت کی جس میں ہم سب دوستوں کو بلایا۔

گذشتہ سات آٹھ برس سے اخلاق صاحب اور ان کی بیگم سمن آباد کے اسی مکان میں رہائش پذیر تھے جو چھوٹی مارکیٹ کے عقب میں تھا، بیٹا آسٹریلیا میں تھا، وہ ہر اتوار کو فون کرتا، دو تین برس تک تو وہ مقررہ وقت پر مالک مکان کے فون پر جا بیٹھتے، وہیں بات ہوتی، سال بھر پہلے

خو دان کے ہاں فون لگ گیا اس لیے اتوار کی اتوار فون پر بات ہو جاتی اور وہ مطمئن ہو جاتے ایک دفعہ مقررہ دن اور وقت پر بات نہ ہو سکی تو خاصے پریشان ہوئے اور دو گھنٹے کی ایک نشست میں دو تین بار کہا، ''عینی کا فون نہیں آیا، معلوم نہیں کیا ہوا؟'' فون پر گفتگو کے دوران میں انھوں نے بیٹے سے اپنی بیماری یا کسی دوسری پریشانی کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ ان کی بیگم نے ایک روز مجھے بتایا کہ میں بیٹے سے بات تو کرتی ہوں مگر ان کا اصرار ہے کہ اس سے اپنی پریشانی یا بیماری کا ذکر نہ کیا جائے۔ وہ البتہ عینی کے بارے میں فکرمند رہتے کہ وہ قالینوں کی جو''لاٹ'' کسی دوست سے لے کر گیا تھا وہ بک نہیں رہی۔ چند ماہ بعد ایک روز خوش خوش آئے کہ عینی نے فون پر بتایا ہے کافی مال نکل گیا ہے۔ میں نے ان سے متعدد بار کہا کہ عینی سے واپس آ کر اپنی ملازمت پر جانے کے لیے کہیں۔ جو آدمی اعلیٰ عہدوں پر رہ کر رشوت اور بے ایمانی سے دور بھاگ رہا ہو وہ کاروبار کی ہیرا پھیریوں میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا، بظاہر وہ مجھ سے متفق ہوتے مگر اس کے متعلق فیصلے کا حق انھوں نے بیٹے ہی کو دے رکھا تھا جس نے بہرحال ان کی بیماری اور آخری ایام ان کی بہت دیکھ بھال کی اور ان کی زندگی ہی میں اسلام آباد جا کر فرائض کی انجام دہی کی رپورٹ دے دی۔

سمن آباد کے سات آٹھ برس انھوں نے اسی شان سے گزارے جیسے شاہ ابوالمعالی والے مکان میں گزارے تھے، ہفتے کے ایک مقررہ دن کو وہ گھر سے نکلتے، سامنے اے حمید کا گھر تھا، اس کے ہاں وہ دس منٹ بیٹھتے، پھر تھوڑی دور آگے جا کر عبادت بریلوی صاحب کے ہاں گھنٹہ دو گھنٹہ قیام کرتے اور واپس آ جاتے۔ اس سے زیادہ نقل و حرکت کرنے کی ہمت اب ان میں نہیں تھی۔ دور کے دوستوں میں شاید وہ مہینے میں ایک دو بار میرے پاس آتے۔ اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں تھا، جب ان کا جی چاہتا آ جاتے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ وہ آئے اور میں موجود نہ تھا، وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے۔ روزنامہ مساوات کی ادارت قبول کرنے سے پہلے جب میں بیکار تھا اور وہ ملاقات کے لیے ریگل آتے تھے، میں نے اعلان کر دیا تھا کہ جب بھی آپ آئیں گے واپسی پر آپ کو گاڑی میں گھر پہنچایا کروں گا۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلا۔ وہ راستے میں معذرت خواہ ہوتے کہ آپ کو میری وجہ سے چکر پڑتا ہے۔ ایک دن میں نے حلفاً بیان دیا کہ فاصلہ میرے روز کے راستے سے اور سمن آباد سے وایا اقبال ٹاؤن یکساں ہے، کہیں تو کسی دن آپ کو ساتھ بٹھا کر ماڈل ٹاؤن لے جاؤں گا اور میٹر چیک کرا دوں گا۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں مجھے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے بعد انھوں نے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ البتہ مساوات کے دفتر سے میری ادارتی مصروفیتوں کی وجہ سے وہ اکثر سنگین موسمی حالات میں بھی خود ہی رکشے پر واپس

جاتے۔ ریگل سے ان کے گھر کی طرف جاتے ہوئے گاڑی میں اکثر میں کسی شاعر کا ذکر شروع کر دیتا، پھر وہ اس کے اچھوتے مضامین پر مشتمل اشعار سنانا شروع کر دیتے، انھوں نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا، ''مجھے وقت ملا تو میں ٹیپ ریکارڈ لے کر بیٹھ جاؤں گا، آپ اپنی یادیں بیان کرتے رہیے۔'' انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا، مجھے ہی وقت نہ ملا۔

تین چار برس قبل بے کاری سے تنگ آ کر ایک دوست کی شراکت سے میں نے ماہنامہ جلوہ نکالنا شروع کیا تو میں نے ان سے ہر ماہ باقاعدگی سے کالم لکھنے کی درخواست کی، انھوں نے ''کیسے کیسے لوگ'' کے عنوان سے ایک مستقل کالم لکھنا شروع کیا اور بڑے معرکے کے مضامین لکھے۔ ایک روز میرے پاس آئے اور کہنے لگے یہ مضامین کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔ میں نے انتساب آپ کے نام کر دیا ہے کیونکہ آپ ہی نے یہ مضامین لکھوائے تھے۔

اخلاق صاحب کو دلچسپ بلکہ ابنارمل کرداروں سے بڑی دلچسپی تھی۔ رائل پارک کے حکیم محمد علی کے وہ اسی لیے بڑے مداح تھے، وہ روزانہ ان کے مطب میں جا کر ان کی باتیں سنتے جو اس قسم کی ہوتیں کہ ان سے پوچھا گیا آپ اس شدید گرمی میں کراچی کس کام سے گئے تھے تو انھوں نے کہا بس دوستوں نے ساتھ چلنے کو کہا تو میں نے سوچا کیا ہے سوڈا واٹر پیتے ہوئے ریل گاڑی میں کراچی پہنچ جائیں گے۔ حکیم صاحب ایک تو خالص دہلوی تھے، دوسرے وہ مولوی عبدالسلام کے مزاج شناسوں میں تھے جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ابوالخیر مودودی کے معلم تھے اور بڑے جلالی بزرگ تھے، اپنی کتاب ''یادوں کے سفر'' میں اخلاق صاحب نے مولوی عبدالسلام کا بہت ذکر کیا ہے مثلاً یہ واقعہ لکھا ہے کہ حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری ان سے ملنے اور نظام دکن کا کوئی پیغام دینے ان کے کمرہ کو جانے والی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ گرج کر فرمایا ''بس تمھاری قسمت میں مولوی عبدالسلام کے بالا خانے کی تین سیڑھیاں چڑھنا ہی لکھا ہے، اس سے آگے قدم مت بڑھانا۔ وہ وہیں سے واپس ہو گئے۔ خود اخلاق صاحب کے والد بھی انھیں ان کے پاس لے گئے تھے۔ مولوی سلام صاحب نے صرف اتنا ہی کہا ''اچھا تم ہو وہ صاحبزادے جو مفتی کفایت اللہ کو زچ کرتے رہے ہو، واپس جاؤ اور اپنے والد کو بھی ساتھ لے جاؤ۔''

حکیم محمد علی کے مطب میں مولوی عبدالسلام کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اخلاق صاحب اور حکیم صاحب کے درمیان زیادہ گفتگو پرانے دنوں کی دلی اور مولوی عبدالسلام جیسے یکتائے روزگار لوگوں کے بارے میں ہوتی۔ اخلاق صاحب کے حکیم صاحب سے تعلقات کی ابتدا بھی بڑے دلچسپ طریقے سے ہوئی۔ بیگم اخلاق کو ہر دوسرے تیسرے مہینے پیٹ کا شدید درد ہوتا جسے روکنے

کے لیے کوئی دوا کارگر نہ ہوتی۔ ایک ہی علاج تھا جوان کے پڑوس میں رہنے والی لیڈی ڈاکٹر کرتی تھی یعنی وہ ٹیکہ لگا کر انھیں سلا دیتی۔ چھ سات گھنٹے کے بعد وہ اٹھتیں تو درد ختم ہو چکا ہوتا۔ ایک دفعہ ان پر بیماری کا حملہ ہوا تو لیڈی ڈاکٹر گھر موجود نہیں تھی۔ رات کا وقت تھا۔ اخلاق صاحب پریشان حال پھر رہے تھے کہ کسی نے رائل پارک کے دہلوی حکیم کا پتہ بتایا اور یہ بھی کہا کہ ان کا گھر مطب کے ساتھ ہی ہے۔ اخلاق صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیوی کی بیماری کے بارے میں بتایا۔ بقول اخلاق صاحب کے حکیم محمد علی نے کہا ''میاں ایک آنے کی دوائی دوں گا مگر دس روپے لوں گا۔ سات برس تک دوبارہ یہ درد نہیں ہوگا۔'' اخلاق صاحب نے دس روپے نذر کئے۔ انھوں نے دو گولیاں دیں۔ درد نہ صرف ٹھیک ہو گیا بلکہ آئندہ سات آٹھ برس تک بیگم اخلاق احمد پر دوبارہ اس بیماری کا حملہ نہیں ہوا۔ اس دن سے ان دونوں میں دوستی اور محبت کا ایسا رشتہ بندھا کہ اخلاق صاحب کا وہاں کا روز کا پھیرا ہونے لگا۔ پھر انھوں نے حکیم صاحب کا ایک بہت خوبصورت خاکہ بھی لکھا جو ان کے مضامین کے مجموعہ میں شامل ہے۔ حکیم صاحب سے اخلاق صاحب کی وجہ سے میرا بھی میل جول رہا۔ واقعی کمال کے آدمی تھے، ایک روز میں گیا تو مطب میں نہیں تھے، تھوڑی دیر بعد آئے تو معذرت کی کہ رات کو وہ بائی سکوپ دیکھنے چلے گئے تھے اس لیے صبح اٹھنے میں دیر ہوئی۔''

ان کی عمر سو برس کے لگ بھگ تھی، میں نے ان کی بات سن کر حیرت سے کہا ''حضرت یہ آپ کو بائی سکوپ دیکھنے کی کیا سوجھی؟''

کہنے لگے، ''میاں! میرا جب منہ نوچنے کو جی چاہتا ہے بائی سکوپ دیکھنے چلا جاتا ہوں۔''

اخلاق صاحب ان کا ایک اور دلچسپ واقعہ سنایا کرتے تھے وہ یہ کہ لاہور کے ایک بڑے زمیندار کے گھٹنے بیکار ہو گئے۔ انھوں نے بہت علاج کرائے، یورپ بھی گئے مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ کسی نے انھیں حکیم صاحب کا پتہ بتایا۔ وہ آئے تو کیفیت سن کر حکیم صاحب نے کہا ''میاں دس دن میں چلنے پھرنے لگو گے۔''

زمیندار اور اس کے عزیزوں نے پیشکش کی کہ تندرست ہو گئے تو حکیم صاحب جو مانگیں گے ان کی نذر کیا جائے گا۔

''اپنا وعدہ یاد رکھنا۔'' یہ کہہ کر حکیم صاحب نے دس دن کی دوائی دے دی۔

دس روز میں مریض واقعی چلنے پھرنے لگا۔ تندرست ہونے کے بعد وہ اور اس کے اہل خاندان جلوس کی شکل میں ڈھول تاشے بجاتے مطب پہنچے اور حکیم صاحب سے پوچھا کہ کیا نذرانہ

پیش کریں۔

''ایک مکان نہ بہت بڑا اور نہ بہت چھوٹا۔ ایک موٹر کار نہ بڑی نہ چھوٹی، درمیانی ہو، مکان ایسا ہو جس میں رہائش کے ساتھ مطب کی گنجائش بھی ہو۔'' حکیم صاحب نے کہا۔

آنے والوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ بندوبست کر کے دوبارہ حاضر ہوں گے۔

وہ چلے گئے تو کسی نے حکیم صاحب سے کہا، یہ آپ نے کیا کیا؟ ان سے پانچ دس ہزار روپے مانگ لیتے تو وہ دے بھی دیتے، آپ نے انھیں بھگا دیا۔

کہنے لگے۔ ''مجھے معلوم ہے یہ لوگ اب واپس نہیں آئیں گے، میں نے بھی دو روپے کی طباشیر سے ان کا علاج کیا ہے، میرا بھلا کیا نقصان ہوا؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ دوبارہ نہیں آئے۔

افسوس ہے کہ گذشتہ تین چار برس سے اخلاق صاحب حکیم محمد علی کے پاس پہنچ نہیں پائے تھے۔ دو برس پہلے حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے کے دو تین برس میرے ذریعے دونوں ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے رہتے۔ میرے مالی حالات سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اخلاق صاحب ہمیشہ میرے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔ آپ نے اخبار کی ملازمت کے ساتھ ساتھ جو کاروبار کیے یعنی سیمنٹ فروشی اور فلم سازی، لوگوں نے ان سے بہت دولت کمائی ہے اس لیے سب سمجھتے ہیں کہ آپ بھی بہت دولت مند ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ آپ نے یہاں بھی مار کھائی ہے۔ وہ کچھ کر تو نہیں سکتے تھے کہ ان کی حالت ہمیشہ مجھ سے بھی خراب رہی ہے مگر ان کے دو بولوں سے تسلی ہو جاتی، دل کو قرار سا آ جاتا۔ اپنے بارے میں تو وہ کسی سے کوئی بات ہی نہیں کرتے تھے، ایک دفعہ یہ بات ضرور بتائی کہ فلاں دوست سے میں نے پچاس ہزار روپے قرض لیے تھے۔ انھوں نے دے بھی دیے مگر تیسرے ہی روز فوری اور ہنگامی ضرورت کا عذر پیش کر کے رقم لینے آ گئے۔ مجھے صرف یہ بتانے کے لیے یہ قصہ دہرایا کہ جب انھیں اعتبار نہیں تھا تو پہلے رقم کیوں دی، دو چار روز بھاگ دوڑ کر کے بہر حال انھوں نے یہ رقم لوٹا دی۔

ریڈیو پاکستان میں ایک زمانے میں خوشامد کا بہت زور رہا، محکمانہ ترقیاں، گریڈ، نوازشیں، اور مراعات خوشامدیوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ اخلاق صاحب تو مطلب برآری یا ذاتی فائدے کے لیے کسی کی خوشامد کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ خوشامدیوں کی وجہ سے ان کی حق تلفی بھی ہوئی مگر وہ اپنی حق تلفی کا ذکر کرنے کی بجائے اپنے رفیقان کار کی پستی اور گھٹیا پن پر پریشانی ظاہر کرتے اور کہتے ''جانے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟'' اپنی ذات کی نفی تو وہ برسوں پہلے

کر چکے تھے۔

ضیاء الحق کے مارشل لا کے دور میں ریڈیو پر حکم نامہ آیا کہ تمام ملازمین باجماعت نماز پڑھیں اور ہر شعبے کے سربراہ اپنے ماتحتوں کا ریکارڈ رکھیں۔ان رپورٹوں کی روشنی کے سوا کمانہ ترقی نہیں دی جائے گی۔حکم حاکم سمجھ کر سبھی نماز پڑھنے لگے۔اخلاق صاحب کے شعبے کے سربراہ نے بہت زور مارا کہ وہ ایک دفعہ جماعت میں شامل ہو جائیں تا کہ وہ ان کی مثبت رپورٹ تیار کر سکے مگر وہ نہیں مانے،ان کا کہنا تھا''میں اگر خدا کی نماز نہیں پڑھتا تو بندے کی کیسے پڑھوں۔''

اخلاق احمد دہلوی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں،وہ بہت پیارے دوستوں،گزرے زمانے کے ہیرے موتیوں کے ساتھ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ان کا آخری سفر ایسا ہی تھا جیسی زندگی انھوں نے پاکستان آ کر گزاری۔میں نے ان کے بیٹے سے یہ پوچھا نہیں کہ اس نے معمول کے مطابق ان کے تمام دوستوں کو اطلاع دے کر ان کا شاندار جنازہ بنانے اور اٹھانے سے گریز کیوں کیا۔

ممکن ہے اخلاق صاحب نے آخری وقت میں اس سے کہہ دیا ہو کہ میرے دوستوں کو اطلاع نہ دینا خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔

ممکن ہے ان کے بیٹے نے جوان کا مزاج شناس بھی تھا خود ہی اندازہ کر لیا ہو کہ اس کے والد کو لوگوں کا ہجوم جمع کر کے جنازہ اٹھانے اور رونے پیٹنے کے مظاہر سے نفرت تھی،اس لیے اس نے خود ہی یہ فیصلہ کیا ہو۔

❀